س۔ ع۔ ر۔ امین۔ میر نگری
بی اے ایل ایل بی

اسلامی نظام تعلیم پر ایک نظر

> دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی سے فوری ضرورت پوری نہیں ہوسکتی پورے نظام تعلیم کا جائزہ لیا جائے

غلبۂ افرنگ سے قبل برصغیر پاک و ہند اور دیگر اسلامی ممالک میں ایک ہی نظام تعلیم رائج تھا۔ صدرِ اسلام سے لے کر بنی اُمیہ کے عہد تک قرآن، تفسیر و حدیث پر زور رہا۔ بنی عباس کے عہدِ مامونی سے فلسفۂ ہیئت اور منطق بھی شامل نصاب ہوگئے عباسی عہد کے اواخر میں جب سلاجقہ منظر شوکت و عروج پر آگئے تو دنیائے اسلام کے مشرقی علاقوں میں اس نصاب تعلیم نے مختلف نام پائے اس کا سبب مختلف بڑے بڑے مدارس کی مقبولیت تھی اور سید الوریٰ مویدالملک ابوالحسن علی نظام الملک طوسی وزیر اعظم عضدالملک الپ ارسلان سلجوقی کی ذاتِ گرامی تھی۔ جس کی غیر معمولی دلچسپی اور شغف علمی کی بدولت دنیائے اسلام علم و فن کے مدارس کے لحاظ سے رشک یونان بن گیا تھا۔ ہرات، نیشاپور، اصفہان، بصرہ، رے، بخارا، شیراز، حلب، موصل اور بغداد میں مدارس کے جال بچھ گئے۔ اور شاہِ وقت ملک شاہ سلجوقی کے احکام برائے قلعہ بندی کے علی الرغم نظام الملک مدارس پر مدارس قائم کرتے رہے اور ملک شاہ کے استفسار پر ان مدارس کو ہی قلعہ کا نام دیا۔

ان مدارس کے نصاب تعلیم اور نتائج کی مقبولیت کے پیش نظر بعد کے سلاطین نے بھی اپنے اپنے علاقہ میں نوریہ مستنصریہ ستیہ۔ صلاحیہ۔ رواحیہ اور ناصریہ نامی مدارس دمشق۔ قاہرہ۔ مالقہ۔ قبرص اور قیروان میں قائم کئے۔

ان مدارس کے فارغ التحصیل طلبا نے ساڑھے پانچ سو سال تک دنیا کو اخلاق، تہذیب، فلسفہ، تاریخ اور دیگر فنون کا درس دیا۔ اس نصاب تعلیم میں دنیا و عقبیٰ ہر دو کو سنوارنے کی عظیم صلاحیت تھی۔ دِلّی۔ بدایوں۔ اُوچ۔ ٹھٹھہ۔ ملتان سے لے کر قرطبہ و غرناطہ تک پھیلے ہوئے مدارس کے فضلا اور کاملین فن کا احصار و احاطہ ناممکن اور انتہائی مختصر فہرست کے

لئے بھی ضخیم جلدیں ناکافی ہیں۔

تاریخ تمدن شاہد ہے کہ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت انتہائی جامع اور نتیجہ خیز تھا اور اس حد تک کہ چوتھی صدی ہجری سے لے کر نویں صدی تک مسلمان ذہنی ارتقار کے بام عروج پر رہے۔ ہر شعبہ علم وفن میں امامت و سیادت انہیں کو حاصل تھی فضلاء اسلام اس "قانون فکر" اور نظام اجتہاد کو پا گئے تھے جس کی صداقت تفسیر و حدیث میں ہی نہیں بلکہ ہیئت و طب میں بھی مسلم ہے۔

یہ نظام فکر خالص علمی و منطقی تھا جس کے ذریعہ مفکرین اسلام نے معلوم سے غیر معلوم کو متصور اور متعین کیا اور یہی انداز فکر قیاس، درایت اور اجتہاد بن کر اسلامی تہذیب کے فروغ کا سبب بنا۔ بلکہ مدتوں اس کی حفاظت کی اور مجاہدات علمی اور تنہ ہیں زندگی کے بے شمار معرکے سر کر سکا۔

دنیا آج تہذیب و تمدن، شعور و ثقافت کی جس منور شاہراہ پر گامزن ہے یہ سب کچھ اسی اصولِ فکر کی مرہونِ منت ہے جس کی داغ بیل قرطبہ۔ اشبیلہ۔ غرناطہ۔ بغداد۔ مالقہ کے مدارس و جامعات میں پڑی۔ اس کے برخلاف " دانش مغرب " یا عصری علوم جدیدہ کی ارتقائی مسابقت مغربی اقوام جس کے مدعی ہیں اور جیسے وہ اعجاز و افسوں قرار دے کر نسلِ انسانی کو فکری اور ذہنی طور پر مرعوب رکھنے پر تلے ہوئے ہیں یہ محض اکتسابی ہے اور اس کی عمر تین سو سال سے زیادہ بھی نہیں اور اب تو یہ رازِ معلوم عوام ہے کہ حکمت افرنگ کے تمام سرچشموں کا منبع سرزمین مشرق ہے۔

الفضل بما شہدت بہ الاعداء۔ ایک مغربی دانشور موسیو رابرٹ بریفالٹ اپنی تصنیف

THE MEANING OF HUMANITY

میں لکھتے ہیں "اگرچہ یورپ کی ترقی کا ایک بھی پہلو ایسا نہیں جس سے قطعی طور پر اسلامی ثقافت کے نقوش کا پتہ نہ ملتا ہو لیکن خاص طور پر اس قوت (سائنس) کی پیدائش پر اس کے اثرات جس قدر واضح ہیں وہ کسی دوسری جگہ نہیں۔ سائنس اپنے وجود کے لئے عربوں کی مرہون منت ہے۔ سائنس صرف حیرت انگیز دریافتوں اور انقلاب آفریں نظریوں کی حد تک ہی نہیں بلکہ اس سے بہت زیادہ عربوں کی احسان مند ہے۔ ہم جسے سائنس کہتے ہیں وہ مغرب میں حقائق اشیاء کے تجسس کی نئی اسپرٹ تجربہ، تحقیق اور تجرباتی تحقیق کے نئے طریقوں اور مشاہدات کی ان نئی عادتوں کے نتیجے میں ابھری جن سے یونانی ناواقف تھے اور عربوں نے یورپ کی سرزمین میں اس اسپرٹ اور ان طریقوں سے دنیا کو متعارف کرایا"

ڈاکٹر لوسین لبارک اپنی تالیف ECCLESSIATICAL کے مصنف لکھتے ہیں۔

"اس امر کا اعتراف کرنا چاہئے کہ طبیعات۔ نجومیات۔ فلسفہ۔ ریاضیات۔ ہو یا کیمیا ر وہ تمام علوم جو دسویں صدی

سے یورپ میں پھیلے، اصل میں عرب علماء سے حاصل کیے گئے تھے:

مشہور و معروف اہل قلم جارج سارٹن فضلائے اسلام کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

"سب سے زیادہ گراں قدر، سب سے زیادہ گراں قدر، سب سے زیادہ اوریجنل اور سب سے بڑھ کر منفرد کتابیں عربی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ آٹھویں صدی کے نصف آخر سے گیارہویں صدی کے اختتام تک عربی ہی بنی نوع آدم کی سائنسی اور ترقی پسند زبان تھی اس دور میں اگر کوئی شخص علوم متداولہ سے بہرہ ور ہونا چاہتا تھا تو اسے عربی ہی پڑھنی پڑتی تھی۔ یہاں ان چند درخشندہ ہستیوں کے نام کا ذکر کافی ہے۔ مغرب میں جن کے معاصر ناپید ہیں۔

جابر بن حیان[1]۔ محمد بن موسیٰ الخوارزمی[2]۔ الفرغانی[3]۔ زکریا الرازی[4]۔ ثابت بن قرۃ[5]۔ البطانی[6]۔ ابونصر فارابی[7]۔ ابوریحان[8] محمد البیرونی۔ ابن یونس الصقلی[9]۔ محمد الکرخی[10]۔ ابن الہیثم[11]۔ عمر خیام[12]۔ ابوالقاسم الزہراوی[13]۔ علی بن عباس[14]۔ حسین بن ابوعلی سینا[15] المسعودی[16]۔ ابن خلدون[17]۔ ابوعلی انساعاتی[18] اور ضیاء ابن بیطار[19]

اگر کوئی کہے کہ ازمنہ وسطیٰ میں قحط الرجال تھا تو مندرجہ بالا نام سے جو ۵۰، سے کر ۱۱ کے درمیان ہو گزرے ہیں۔

اقتباسات مذکورہ کے اندراج کے ساتھ ایک مغالطہ کا ازالہ ضروری ہے وہ یہ کہ اس تحریر کا مقصد نہ اسلاف پرستی ہے اور نہ پدرم سلطان بود جتانا ہے اس لئے کہ مشہور عربی مقولہ ہے

بجدٍ لا بجد کلّ مجد وماجدٌ بلا مجدٍ بجدٍ

(ہر بزرگی اپنی ہی کوشش سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ آباؤ اجداد کا نام لینے سے اور آباء و اجداد کا نام لینے) سے اور آباء واجداد کا نام لینا بھی انہی کو زیب دیتا ہے جن میں خود کوئی بزرگی ہو۔

اسلاف و اکابر کا ذکر محض ایک تاریخی حقیقت کی حیثیت میں کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ حکمت جدیدہ کا تذکرہ اصحاب کبار کے علمی مجاہدات کا ذکر کئے بغیر ممکن ہی نہیں۔

بعض اصحاب جنہیں اسلاف کی ہر بات میں برائی نظر آتی ہے اور افرنگ کی ہر بات میں حکمت اور جو ڈاکٹر سخاؤ کا قول نقل کرتے نہیں تھکتے کہ "اگر مسلمانوں میں اشعری و غزالی نہ ہوتے تو آج تک دنیا میں سینکڑوں گلیلو اور نیوٹن پیدا ہو چکے ہوتے۔

ایسے اصحاب کی خدمت میں اطلاعاً عرض ہے کہ اشعری و غزالی کا قصور محض یہ ہے کہ انہوں نے فلسفہ کو الحاد اور مادہ پرستی سے بچایا ہے اور ان حضرات نے علم و فن کے ہر شعبہ کو فروغ دیا۔ مسلمان تو محض تلقین غزالی سے محرومی کے نتیجے میں پسماندہ رہ گئے کہ وہ ترقی جس کا اس تدریج چلے بذات خود کیا کچھ ہے۔ وہ مروت ایثار و اخلاص، اخلاق و دیانت جیسے اساسی اقدار سے محروم کے سوا تہذیب سے ہیں کیا یہ حال یہ ہے کہ دنیا اس تہذیبی ترقی کے باوجود لاکھوں زار و نزار ہے

نالاں ہے پابجولاں ہے۔ بقول حکیم مشرق ؂

یہ علم یہ حکمت یہ تدبیر یہ حکومت — پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

مسلمانوں نے بھی اگر برق و بخارات کی دیوی کو پوجنا شروع کر دیا ہوتا تو جانے آج دنیا تاریکی کے کس غار میں ہوتی اور یہ سب کچھ کیا طاغوتی ترقی نہ ہوتی۔ تاریخ کہتی ہے کہ ازمنہ وسطیٰ میں مسلمانوں پر جن راستوں سے یلغار ہوئی اس کی نشاندہی ابھی باقی ہے اور اس ضمن میں مفکرین کی آراء میں خاصا اختلاف ہے۔

گلیلو اور نیوٹن بے چارے تو خود ابن الہیثم اور الخوارزمی کے خوشہ چین رہے ہیں۔ حق یہ ہے کہ تحصیل علم اور حکمت اشیاء پر جس انداز سے قرآن حکیم اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے روشنی ڈالی ہے اور جس طرح علم کی فضیلت کو بیان کیا اس کا ہی اثر تھا کہ مسلمان تحصیل علم کی راہ کی ہر مشقت کو رحمت و سعادت سمجھتے تھے اور وہ ہر طرح کی مشقت برداشت کر گئے اور پہلی صدی ہجری میں تمام مشکلات پر قابو پا گئے۔ حتیٰ کہ حدود اسلامی کا ہر شہر و قریہ علم و حکمت کا سرچشمہ گہر خیز بن گیا تھا۔ صدر اول میں مسلمانوں نے انفس و آفاق تک رسائی حاصل کر لی تھی اور وہ بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا کر عصائے کلیمی کا اعجاز دکھانے کے لئے مضطرب تھے۔

اہل اسلام کی حیرت انگیز رفتار ترقی کے پس پشت، اخوت، مساوات، عقیدہ توحید۔ تدبر قرآن کا جذبہ کارفرما تھا اور مسلمان ایک طرف مطالعۂ کائنات کو تعمیل حکم ربانی سمجھتے تھے تو دوسری طرف حکمت اشیاء اور مظاہر فطرت پر غور و فکر کو تلاوت کلام الٰہی کا درجہ دیتے تھے چنانچہ اہل اسلام جامعہ نظامیہ بغداد کی تاسیس سے بہت پہلے ہی مصر و یونان کے دفاتر حکمت کے تنقید و تجزیہ کا کام شروع کر چکے تھے۔ عہد مامونی میں "بیت الحکمت" کے قیام سے تحصیل علم کی تحریک کو عروج نصیب ہوا نہ صرف مصر و یونان بلکہ روم، ہند اور پارس کی کتابوں کے لئے بھی مترجمین کی خدمات حاصل کی گئیں اور ایک ایک کتاب کا ترجمہ کئی کئی مرتبہ، اور متفرق مترجمین کے ہاتھوں ہوا۔ اس علمی خدمت کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے اور بغداد فخر بلاد جہاں بن گیا۔ وہیں دنیا کا سب سے پہلا شفاخانہ قائم ہوا۔ وہیں سب سے پہلے زمین کی پیمائش کی گئی۔ عرض البلد اور طول البلد کا تصور قائم کیا گیا۔ "صورۃ الارض" نامی علم جغرافیہ کی پہلی کتاب لکھی گئی۔ الغرض نئی تہذیب کی بنیادیں استوار ہوئیں ؂

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ — ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

عجمی نژاد منافقین نے فلاسفہ اور متکلمین کی شکل میں جب اس تحریک علمی کی دشمنی شروع کی تو عقیدہ توحید، فلسفہ ذات و صفات کا شکار ہو گیا اور قومی متاع کردار امت کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ باطنیہ اور معتزلہ نے فلسفیانہ موشگافیوں کے ذریعہ اس علمی تحریک کے آگے بند باندھ دیا۔ اور تفسیر و حدیث کے زیر سایہ مطالعۂ فطرت کا رخ فلسفہ و استدلال کے تابع

جہاں ارسطو و افلاطون کی حکمرانی تھی۔ اس سعت قہقری کو کیا کہیئے کہ خرد دشمنی کو تصوف وعرفان کا نام دیا گیا۔ اس کے نتائج کا خمیازہ امت کو اٹھانا پڑا اس کی ایک جھلک محترمہ خالدہ ادیب خانم کے محاکمہ میں ملتی ہے۔

"جب تک دنیا پر متکلمین کے فلسفہ کی حکومت رہی ترکی کے علماء اپنا کام نہایت خوبی سے کرتے رہے۔ مدرسہ سلیمانیہ مدرسہ فاتح" اور مدرسہ بحریہ " اس زمانہ میں تمام مروجہ علوم وفنون کے مرکز تھے مگر جب مغرب نے کلام کی زنجیروں کو توڑ کر سائنس کی بنیاد ڈالی تو دنیا کی زندگی میں انقلاب آگیا۔ علماء کی جماعت تدریسی کے فرائض انجام دینے کے قابل نہیں رہی یہ حضرات سمجھتے تھے کہ علم جس مقام پر تیرھویں صدی میں تھا اس سے آگے نہیں بڑھا۔ یہ طرز خیال انیسویں صدی کے وسط تک ان کے نظام تعلیم پر حاوی رہا۔

ترکی اور دیگر ممالک کے علماء کا یہ انداز جذبہ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا تھا۔ فلسفۂ کلام خواہ عیسائیوں کا ہو خواہ مسلمانوں کا یونانیوں کے فلسفہ پر مبنی تھا اور اس پر کم وبیش ارسطو کے خیالات کا رنگ غالب ہے جو ایک ملحد فلسفی تھا قرآن حکیم میں عالم طبعی کی تخلیق کے مسائل کا تفصیلی وتشریحی ذکر نہیں اس کی تعلیم میں بہت زیادہ اہمیت اخلاقی ومعاشرتی زندگی کو دی گئی ہے۔ یہ کتاب دنیا کے لئے ایک قانون عمل لے کر آئی ہے اس میں مابعد الطبعی مسائل اور روحانی معارف بھی جہاں کہیں بیان ہوئے ہیں ان میں کوئی پیچیدگی یا اشکال نہیں اس کی بنیادی تعلیم توحید ہے اسی وجہ سے اسلام ایک سادہ اور سہل مذہب ہے اس میں تمام دوسرے مذاہب کی نسبت کہیں زیادہ گنجائش ہے کہ عالم طبعی کے نظریات کو قبول کر سکے۔ مگر یہ سادگی اور وسعت نظر جو علمی تحقیقات کے لئے اس قدر سازگار تھیں مسلمانوں میں زیادہ دن نہیں رہنے پائی۔ نویں صدی میں علماء متکلمین نے نہ صرف فقہ بلکہ الہیات کو بھی اصول وضوابط کی زنجیروں میں جکڑ دیا اور یوں اجتہاد و تحقیق کا دروازہ بند ہو گیا اور پھر اسلامی فلسفہ میں ارسطو کے خیالات دخیل ہو گئے بخلاف اس کے دین عیسوی میں جسے حضرت مسیح علیہ السلام کا مذہب نہیں بلکہ سینٹ پال کا مذہب کہنا زیادہ موزوں ہے۔ کتاب پیدائش کے اندر عالم طبعی کی مفصل تفصیل وتشریح موجود ہے۔ عیسائی دنیا اسے خدا کا کلام تسلیم کر چکی تھی۔ اس لئے ان پر فرض عائد ہوتا تھا کہ وہ اس تفسیر عالم کی عقلانیت کو ثابت کریں اس تاویل میں مشاہدہ اور تجربہ ان کا ساتھ نہیں دیتا تھا اس لئے انہیں استدلال کی مدد لینی پڑی۔ ارسطو کا دامن انہوں نے اس لئے پکڑا کہ اس کی منطق سحر انگیز تھی۔

جب مغرب نے فطرت کا مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ، تجزیہ اور تحلیل کے ذریعہ شروع کیا تو ارباب کلیسا کے ہوش اڑ گئے۔ ادھر نئے علمی طریقوں کی مدد سے بڑے بڑے انکشافات ہونے لگے۔ ادھر عیسائی علماء کو یہ خوف پیدا ہوا کہ اب کلیسا کی حکومت کا خاتمہ ہے۔ چنانچہ مغرب میں اس دور کا آغاز ہوا جس میں بڑے بڑے سائنس دان جو عالم طبعی کے دائرہ

کے اندر تحقیق میں مصروف تھے قتل کر دئے جاتے تھے۔ سائنس و مذہب کے خوں ریز معرکوں کے بعد عیسائی کلیسا کو مصلحت شناسی سے کام لینا پڑا۔ اس نے اپنے مدرسوں اور مکتبوں کے نصاب میں سائنس کو داخل کر لیا۔ اس کی یونیورسٹی جو پہلے بالکل اسلامی مدارس کی طرح کی تھیں۔ سائنس اور علوم جدیدہ کا مرکز بن گئیں مگر اس کے ساتھ اس نے مابعد الطبیعی فلسفہ کو بھی مہیب چھوڑا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسا کا اثر تعلیم یافتہ طبقہ کے کم از کم ایک حصہ پر باقی رہا۔

عثمانیوں کے آخری دور میں علماء کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی۔ انہوں نے علوم جدید کی تحصیل کی طرف کوئی توجہ نہ دی بلکہ نئے خیالات کو اپنے قلمرو میں داخل نہیں ہونے دیا جب تک ملت اسلامی کی تعلیم کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں رہی کیا مجال کہ کوئی نئی چیز قریب آنے پائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے علم پر جمود طاری ہو کر رہ گیا۔ ادھر دور انحطاط میں ان کی سیاسی مصروفیتوں میں اس قدر اضافہ ہوا کہ مشاہدہ اور تجربہ کے جھمیلے میں پڑنے کی انہیں فرصت نہ تھی سہل نسخہ یہی تھا کہ ارسطو کے فلسفہ پر قدم جمائے رہیں اور علم کی بنیاد استدلال پر رہنے دیں۔ چنانچہ اسلامی مدارس کا انیسویں صدی میں بھی وہی رنگ رہا جو کہ تیرہویں صدی میں تھا۔

(ترکی میں مغرب و مشرق کی کشمکش)

خالدہ ادیب خانم

اسلامی دنیا کے تمام تعلیمی حلقوں پر سقوط غرناطہ و بغداد کے اثرات طاری رہے۔ نتیجۃً جمود تقلید کی حکمرانی رہی اور اجتہاد سے گریز نے علمی و فکری ماحول پر انحطاط طاری رکھا علمی تحقیق کے تنزل کا سبب یہ بھی ہوا کہ درس نظامی کے نصابی متون کی تخریج و تخریج ہوتی رہی۔ شروح و حواشی نے اصل کتاب کی جگہ لے لی۔ عالم اسلام میں تقلید جامد کے ساتھ متقدمین کی علم آموز ذوق آفریں کتابیں رفتہ رفتہ نصاب سے خارج ہوتی گئیں۔ اور ان کی جگہ متاخرین کی کتابیں داخل نصاب ہوئیں جو اپنے میں درجۂ اجتہاد نہیں رکھتی تھیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ عصری تقاضوں پر علمی گرفت ڈھیلی ہوتی گئی۔ ہر چند کہ ملت کے انحطاط کے اسباب و عوامل کئی ہیں لیکن سیادت و فکری قیادت کی محرومی کو سب سے بڑا سمجھنا چاہئے اور عہد جدید کے مسائل کو حل کرنے کے لئے مسلمانوں کو اپنے نظام تعلیم کی نئی شیرازہ بندی کرنی چاہئے۔ یہی زندہ قوموں کا شعار ہے اور ہمارے اسلاف اسی اصول پر کاربند تھے۔ ہر دور کے اپنے تقاضے ہوا کرتے ہیں چنانچہ عہد حاضر کا بھی تقاضا ہے کہ مسلمان "سبزۂ بیگانہ" یعنی لارڈ میکالے کے مرتب کردہ نصاب تعلیم کی گرفت سے آزاد ہو کر اپنی تعلیم اپنے ہاتھ میں لیں اور ملی تقاضوں کے پیش نظر اس دیرینہ دوعملی کو ختم کریں اور دو نظام تعلیم سے قوم کو نجات دلائیں۔ صرف دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی سے قومی ضرورت پوری نہیں ہو سکتی۔ اب جب کہ نفاذ شریعت کی بات کی جا رہی ہے اور نظام معاصل

باقی صفحہ ۳۳ پر